"جی صیب!"

"اب اِدھر کس طرح سے آگیا؟"

"پہاڑ گھوم گیاناں صیب۔"

"پہاڑ گھوم گیا!"

"تم گھوم گیاناں صیب، گھم گھیٹی کے ساتھ" کہستانی زور سے ہنسا" اور پھر سب کچھ گھوم گیا۔ گھومنے کا مطلب سمجھتا ہے صیب!"

"پہلے سمجھتا تھا" مسعود نے کہا" چھوٹا موٹا۔ اب نہیں سمجھتا۔"

"پہلے بھی نہیں سمجھتا تھا" عمّاد بولا۔" یہ نیک آدمی ہے اس کو راہِ راست کے سوا اور کچھ معلوم نہیں۔"

"اوئے تُو نے بچپن میں بھی کوئی الٹ بازی نہیں لگائی" مفتی نے پُوچھا۔

"حد ہوگئی یار — عمّاد — دیکھو دیکھو — اُدھر تو نہیں تھا سُورج جب ہم نے موڑ کاٹا تھا" اعظمی نے رُک کر کہا اور اس کے ساتھ ہم سب رُک گئے۔

لیڈر اس رُکنے پر غم، غُصّے، خوف اور سرزنش سے بھر گیا۔ کھنکار کر بولا:

"اب اگر تم جھیل کے پانی کو صرف ہاتھ لگا کر بھی لَوٹ سکے، تو عشاء سے پہلے ناران واپس نہیں پہنچ سکو گے۔"

صرف میں نے لیڈر کی اس بات کا وزن محسوس کیا، باقی سب سُورج کے زاویے کا حساب لگاتے رہے اور عمّاد انہیں اپنی سائنس کے زور پر سمجھاتا رہا کہ سُورج اپنی جگہ پر قائم ہے۔ پہاڑ بڑی آہستگی کے ساتھ گھوم رہا ہے اور ہم تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان تینوں حوالوں نے تمہارے اندر اشتباہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے، ورنہ سُورج اپنی جگہ پر قائم ہے اور ساکت ہے۔"

ساکت نہیں ہے جی، ساکت نہیں ہے صیب!" کہستانی تڑپ کر بولا" سُورج بالکل ساکت جامد نہیں ہے۔ بالکل بے جان نہیں ہے۔ یہ حرکت کرتا ہے صیب، ملتا ہے۔ ہر شے اللہ کے حضور میں حرکت کرتی ہے۔ ہر شے اس کے حکم سے چل رہی ہے۔ ہر چیز خُدا کے سامنے

فانی ہے۔ حکم کے مطابق ہے۔"

لیڈر نے کہا:

"چلو ـــــ خدا کے لیے!"

مفتی بولا:

"چلو"

عماد نے کہا:

"اگر میرے پاس کاغذ ہوتا، تو میں نقشہ بنا کر سمجھاتا کہ ان ریلیشن ٹو سن ہماری کیا پوزیشن ہے؟"

لیڈر نے اس کے کندھے پر سوٹی ماری اور خوفزدہ ہو کر کہا:

"پلیز!"

اور ہم سب پھر اُسی رفتار سے چلنے لگے، پھر اچانک میں نے لیڈر کا چہرہ دیکھ کر محسوس کیا کہ منزل قریب آ رہی ہے اور جب ہم اگلا موڑ کاٹ کر سامنے کے بل کی طرف جائیں گے اور وہ بل کھلے گا، تو سامنے جھیل ہو گی اور جھیل کے گرد مدھرے قد کے پہاڑ ہوں گے اور ان پہاڑوں پر سے کئی قسم کی ہوائیں گزر چکی ہوں گی۔ منقلب اور غیر منقلب ہوائیں اور تجارتی ہوائیں اور پھر ہواؤں کے مختلف منطقے اور ان کے چکر، پہلو بہ پہلو، ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اُفقی چکر، عمودی چکر، کٹے ہوئے جھونکے، بڑے بڑے ہوائی میدان، ہواؤں کے ریگستان، باد کے برِ اعظم، چوڑائی کے رُخ، لمبائی کے رُخ اور اُونچائی کی جانب، آسمانوں کی سمت اور زمینوں کی طرف!

مجھے یاد ہے گرمیوں کی ایک صبح، دوپہر سے ذرا سا پہلے کوئی گیارہ بجے کے قریب میں نے گلبرگ میں ہوا کا ایک جھونکا دیکھا تھا۔ ہوم اکنامکس کالج کے سامنے۔ گلبرگ ڈاکخانے کی جانب، جہاں بس سٹاپ ہے۔ جدھر ڈھاک کی قسم کے ولایتی پیڑ لگے ہیں، وہاں تین لڑکیاں بس کا انتظار کر رہی تھیں اور ان میں لمبے قد کی درمیانی لڑکی سے ہوا کا یہ جھونکا گلے ملا تھا اور پھر واپس اُوپر کو چڑھ گیا تھا۔ دراصل یہ جھونکا اس لڑکی کا خاندانی جھونکا تھا اور کئی صدیوں سے

کُرۂ ارض کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ پھر اتّفاق ایسا ہُوا کہ اُس دن ہیلتھ اینڈ نیوٹریشن کی پروفیسر کا ہاتھ دروازے میں آگیا۔ جلد کٹ گئی ماس باہر آگیا۔ خُون کا فوّارہ بہہ نکلا۔ اُنہوں نے خود ایک ہاتھ اور دانتوں کی مدد سے کلائی پر رُومال باندھا اور زخم کے گرد پٹی لپیٹ کر ایک ہاتھ سے موٹر چلاتی ہوئی ہسپتال پہنچ گئیں۔ زخم کو پُورے تین ٹانکے لگے۔ سرجن نے انہیں ٹیکہ دے کر چند گھنٹوں کے لیے سُلا دیا۔ اور خُود اُن کے کالج فون کر دیا کہ پروفیسر سبطین آج کالج نہیں آسکیں گی۔ یہ تینوں لڑکیاں جو بس اسٹینڈ پر کھڑی تھیں، پروفیسر سبطین کی شاگرد تھیں اور اُن کا پیریڈ خالی ہونے کی وجہ سے وقت سے ایک پیریڈ پہلے گھر واپس جا رہی تھیں۔

چونکہ یہ تینوں لڑکیاں وقت سے پہلے بس اسٹاپ پر آگئی تھیں اس لیے ہوا کا جھونکا درمیانی لڑکی سے گلے مل کر اُوپر کو چڑھ گیا تھا۔ اگر پروفیسر سبطین کا ہاتھ دروازے میں نہ آتا اور اُنہوں نے کلاس لی ہوتی، تو اُس وقت یہ تینوں لڑکیاں کلاس کے اندر بڑی تیزی سے نوٹس لے رہی ہوتیں اور ہوا کا جھونکا وقتِ مقررہ پر جائے مقررہ سے ہو کر بغیر گلے ملے اُوپر چڑھ گیا ہوتا، پھر کوئی ضروری نہیں تھا کہ کبھی واپس لاہور آتا یا کسی صدی میں گلبرگ کے جُغرافیے سے گزرتا یا قرنوں بعد عین سیدھ میں آسکتا، جہاں آج آگیا تھا۔

لمبے قد کی یہ درمیانی لڑکی یُونانی لڑکی تھی۔ اس کی ناک یُونانی نہیں رہی تھی، لیکن اس کی آنکھوں کے نیچے اس کی گالوں کی ہڈیوں کی بناوٹ ابھی بھی یُونانی مجسموں جیسی تھی، حالانکہ نہ اس کو اس بات کی خبر تھی نہ اس کے والدین کو اور نہ ہی اس کے منگیتر کو۔ اس کا والد گورنمنٹ کو کوارٹز سپلائی کرنے کا ٹھیکیدار تھا اور اس کا منگیتر سول ایوی ایشن میں درمیانے درجے کا آفیسر تھا جس کی ترقّی کے آگے چل کر بڑے چانس تھے۔

سکندرِ اعظم کے ساہیوال سے زخم کھا کر واپس چلے جانے کے بعد اس علاقے کو سیلوکس کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ سیلوکس سکندرِ اعظم کا بہت ہی قابل، بے حد وفادار، نہایت خُوبصُورت اور بڑا پیارا کمانڈر تھا۔ اس نے اس علاقے کے لوگوں پر محبت اور شفقت کے ساتھ حکمرانی کی اور بہت سے یُونانی مجسمہ ساز، پہلوان، نے نواز، خوش نویس

بازی گر اور تاجر یہاں آکر آباد ہو گئے۔ یونانی نوجوانوں، یونانی دیوتاؤں نے یہاں کی عورتوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنا سیکھ لیا اور وہ ان کی اس حرکت کو پسند کر کے ہنسنے لگیں اور ہنسی ہنسی میں کئی ایسی شادیاں ہو گئیں جن میں مرمر کے مجسمے صندل کی مورتیوں کے چرنوں میں بیٹھ کر موتی موتی ہو گئے۔ کئی مورکھ لڑکیوں نے پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر اور سروں پر مکٹ سجا کر یونانی لڑکیوں کو ہاتھ اُٹھا کر اس طرح سلام کرنا سیکھ لیا جس طرح سکندرِ اعظم اپنی فوج کے دستوں کو کیا کرتا تھا۔ جب وہ راہ چلتی کسی یونانی دوشیزہ کو ہاتھ اُٹھا کر سلام کرتے، تو ان نٹ کھٹ لڑکوں کی کلائیوں سے سونے کے کنگن لڑھک کر ہاتھی دانت کے بازو بندوں پر آرہتے۔ گریک لڑکیاں ان سے بار بار سلام کرواتیں اور اس گارڈ آف آنر کے نیچے کئی ایسی شادیاں ہو گئیں جن کے بچے بابوں سے زیادہ ماؤں پر چلے گئے اور پھر چلتے ہی گئے ــــ یہ جو درمیان میں لمبے قد کی لڑکی بس سٹاپ پر کھڑی تھی، انہی بچوں میں سے ایک تھی جو ماں کے مہاندرے کی اُنگلی تھام کر چلتی چلتی ہوم اکنامکس کالج میں آگئی تھی اور اپنی ذہانت کی وجہ سے کالج بھر میں مشہور تھی۔

جب سکندر اعظم کو ایک پرانے اَن گھڑت بھالے کے زنگ آلود پھل کا گہرا زخم لگا تھا اور یہ زخم اُس کو ساہیوال کے ایک جانگلی بستی کے وار سے ملا تھا، تو سکندر اعظم اپنی کمان ایسی جھالردار کلغی سمیت زمین پر گر گیا تھا اور جب سیلوکس نے آگے بڑھ کر فاتحِ عالم کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا تھا تو ہوا کا ایک جھونکا ان کے درمیان سے ہو کر ملتان کی طرف نکل گیا تھا اور پھر بے تاب ہو کر سمندروں کی جانب چلا گیا تھا اور وہاں سے دُوسری زور آور ہواؤں کا دباؤ برداشت نہ کر کے پہاڑوں کی طرف بھٹک گیا تھا۔ یہی جھونکا کئی سال تک قراقرم اور ہندوکش کے سلسلوں کے درمیان چکر لگاتا رہا۔ پھر پیری نیئی اور ایلپس کے پہاڑوں میں چلا گیا۔ کئی صدیاں بحرالکاہل اور بحرِ اوقیانوس کے جنگلوں میں گزار دیں۔ ساٹھ پینسٹھ سال تک یہ جھونکا اسکیموؤں کی بستیوں کے گرد منڈلاتا رہا۔ اسکیموؤں کی پوری ایک نسل اس کے سامنے پیدا ہو کر جوان ہوئی اور اُس نے ان کے درمیان سوائے محبت، صلح اور بوس و کنار کے اور کچھ نہ دیکھا۔

کوئی ایک صدی تک یہی جھونکا صحرائے عرب میں چلنے والی ڈاچیوں کی تھوتھنیوں کے اُوپر بڑھتا سمٹتا رہا۔ اس نے یہاں عجیب قوموں کو دیکھا جو عورتوں سے بے پناہ محبّت کرتی تھیں اور سخاوت کے معاملے میں ان کے دل دریاؤں سے بھی بڑے تھے۔ وہ بڑی محنت سے تپتے ہُوئے صحراؤں میں کانٹے دار جھاڑیوں سے ریزہ ریزہ کر کے خوراک حاصل کرتے تھے اور شام کے وقت گلی کوچوں میں فقیرانہ صدائیں دیتے پھرتے تھے۔

"اے مائی باوا ہے کوئی اللہ کے نام پر میرے ساتھ مل کر کھانے والا ـــــ میرے ساتھ شیئر کرنے والا ـــــ مجھے میزبانی کا شرف عطا کرنے والا ـــــ ہے بابا ـــــ ہے سخیا ـــــ ہے مہربانا! ـــــ راہیا! ـــــ مجھ غریب نمانے ـــــ بے آسرا ـــــ بے گھر ـــــ بے در کی بھی عزّت فرما ـــــ میرے دستر خوان پر آ کر کھا ـــــ میرا مان بڑھا ـــــ ہے سخی بابیو! ـــــ سوہنے مسافرو! ـــــ عزّت دار مقیمو! ـــــ یتیمو! ـــــ سردارو! ـــــ اپاہجو! ـــــ مجبورو! ـــــ ننگارو! ـــــ کرم فرماؤ! میرے ساتھ روٹی کھاؤ ـــــ اور بڑے درجے، بڑے رُتبے پاؤ۔"

پھر اسی جھونکے نے مدینے کے شہر میں مکی، مدنی، قرشی، اُمّی کے عاشقوں کو دیکھا اور اُن پر ایک حکم نازل ہوتے بھی سُنا:

"اے ایمان والو! آگے نہ بڑھو اللہ سے اور اُس کے رسولؐ سے اور ڈرتے رہو اللہ سے کہ وہ سُنتا ہے اور جانتا ہے اور اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دُوسرے سے ترّخ کر بولتے ہو، اس طرح سے انؐ کے رُوبرُو نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، خُدا نے ان کے دل تقوے کے لیے آزما لیے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔"

اور پھر اسی جھونکے نے عرفات کے میدان میں اسی شرفِ دو جہاں اور دستگیرِ اُفتادگاں کو دیکھا کہ اپنی اونٹنی پر سوار واپس تشریف لے جا رہے تھے۔

جب شہنشاہِ ہندوستان شاہجہان حضرت میاں میر صاحب کی خدمت میں حاضر

ہُوا اور داراشکوہ اس کے ساتھ داہنے ہاتھ کھڑا تھا اور حضرت میانجیو صاحب کی باتیں عقیدت کے کان سے سُن کر محبت کے دل میں جمع کر رہا تھا، اس وقت ہوا کا یہ جھونکا اِتنا نیچے اُتر آیا تھا کہ حضرت میاں میر صاحب کے مُنہ سے پھینکے ہُوئے لونگ زمین پر ملنے لگے تھے۔

اور آج جب مسز سبلین اپنا ہاتھ دروازے میں آجانے کی وجہ سے کالج نہ پہنچ سکی تھیں اور اُن کے خالی اور آخری پیریڈ میں لڑکیاں گھروں کو روانہ ہوگئی تھیں تو بس سٹاپ پر یہ جھونکا لمبے قد کی لڑکی سے گلے مل کر اُوپر کو چڑھ گیا تھا۔ یہ لڑکی سیلوکس کے خاندان سے تھی اور اس کے ننھیال اور ددھیال دونوں اُوپر جا کر سکندرِ اعظم کے نامور سپہ سالار سیلوکس سے جا ملتے تھے۔ حال ہی میں اس لڑکی کا باپ سُوتر منڈی والا پُرانا گھر چھوڑ کر نیو مسلم ٹاؤن میں آباد ہُوا تھا اور خوش تھا کہ اس کی ٹھیکیداری ٹھکا ٹھک چل رہی ہے اور اس کو کسی طرف سے کسی قسم کے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں۔

لیڈر نے رُک کر کمستانی سے کہا:

"دیکھو! اس کو پھر اُٹھا لو — صاحب کو۔"

"ہرگز نہیں!" مفتی نے چیخ کر کہا۔ "اب مَیں ٹھیک ہُوں اور چل سکتا ہُوں۔"

"آگے پھر چڑھائی آرہی ہے مُفتی!" مسعود نے کہا اور پتہ نہیں کس کو ایک ہلکی سی گالی دی۔

"نہیں یار! مَیں ایسا بھی گیا گُزرا نہیں ہُوں۔ اب بالکل فٹ ہُوں۔ نوبر نو۔ مَیں اس کے کاندھوں پر نہیں چڑھوں گا۔"

کمستانی نے دبی زبان سے کہا:

"اگر ضرورت ہے صیب تو پھر آجاؤ۔"

لیکن اُس کا من حرامی ہو چکا تھا اور وہ کافی بھینس کی طرح ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ عماد نے انگریزی میں لیڈر کو سمجھایا:

"کسی پر اتنا بوجھ ڈالنا بھی ٹھیک نہیں اور جب مفتی صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ چل سکتے

ہیں تو انہیں چلنے دو۔"

"اور اگر نہیں بھی چل سکتے تو بھی ان کو چلنے دو۔" اعظمی نے کہا۔ "کیونکہ چلنا نہ چلنے سے ہر حال میں بہتر ہوتا ہے ورنہ ان کا حال ہماری ملازمہ صغریٰ کی طرح ہو جائے گا جو کہ ہسار مارکیٹ سے گرم مصالحہ لے کر دو گھنٹے بعد گھر واپس پہنچی تھی اور میری بیوی نے پرانے گرم مصالحے کے زور پر ہی پلاؤ پکا دیا تھا۔"

مفتی نے رُک کر کہا:

"ٹھہرو یارو! میں صغریٰ کی بات سُنے بغیر آگے نہیں چل سکتا، کیونکہ میں نے اُسے بڑے غور سے دیکھا ہوا ہے۔"

مسعود نے کہا:

"دیکھا تو ہم نے بھی تھا مفتی جی! لیکن اتنے زور سے نہیں دیکھا تھا۔"

اعظمی نے کہا:

"جب صغریٰ پورے دو گھنٹے بعد گرم مصالحہ لے کر ہمارے گھر پہنچی، تو میری بیوی نے جل کر کہا۔

"اتنی دیر تک کہاں مری رہی بدبخت!"

تو صغریٰ نے رونکھی آواز میں جواب دیا:

"کیا کروں بی بی جی! واپسی پر ایک نوجوان میرے پیچھے چلنے لگ گیا تھا۔ نیلی پتلون اور پیلے سویٹر والا۔"

میری بیوی نے کڑک کر کہا:

"تو دفع کرتی اُس مردود کو، تیرا اُس سے کیا کام تھا بھلا۔ ناک کی سیدھ گھر آتی۔ جلدی جلدی، پیچھے دیکھے بغیر۔"

تو صغریٰ نے غمناک ہو کر کہا:

"میں تو جلدی جلدی چلتی تھی جی! لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ چلتا تھا مر جانا! کتا کسے تھا کا۔"

میں نے بیوی سے کہا:

"اچھا ہی ہوگیا۔ یہ گھر تو پہنچ گئی خواہ دیر سے پہنچی، تو بھائیو! مفتی جی کو چلنے دو، خواہ وہ آہستہ آہستہ ہی کیوں نہ چلیں۔"

"اور شام تک جھیل پر نہ پہنچ سکیں۔" لیڈر نے تقریباً رو کر کہا۔

عماد چڑ کر بولا:

"ایک تو اس کی یہ جھیل ہم سب کو لے ڈوبے گی۔ نہیں پہنچ سکے، تو نہ سہی، کوئی کتاب میں لکھا ہے کہ جھیل تک پہنچنا ضروری ہے۔"

اس نان کوآپریٹو سپرٹ کے بھونڈے اعلان کا جملہ لیڈر کو گولے کی طرح لگا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے واپس بھاگتا گیا، تو ہم بھی اُس کے پیچھے دوڑے، لیکن ہماری دوڑ کمزور تھی۔ کچھ اس وجہ سے کہ ہم آگے لے جانے والی انرجی کو اس طرح سے ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کہستانی بھبھوکے کی طرح لیڈر کے پیچھے بھاگا اور چشمِ زدن میں جا کر اس کو جپھا ڈال لیا۔ لیڈر کہستانی کے کلاجنگ میں بند آہستہ آہستہ اس کو سوٹیاں مار رہا تھا اور کہستانی اسکی جانگھوں میں سر دے کر اس کو کندھوں پر اُٹھا رہا تھا۔ ہم سب نے پہاڑ کے کنارے پر جھک کر زور زور سے تالیاں بجا کر گانا شروع کر دیا۔

اوئے جتا چک لے واگرو کر کے
باہنی گلاس ورگی۔

کوہستانی لیڈر کو کامیاب لیڈر کی طرح کندھوں پر اٹھائے واپس آ رہا تھا اور عمر کامیاب لیڈروں کی طرح کندھے پر بیٹھا اس کو سوٹیاں مار رہا تھا۔

جب اس نے لیڈر کو واپس لا کر ہمارے قریب اُتارا، تو مسعود نے عمر کو انگریزی میں سخت سُست کہا اور لیڈر نے غصّے میں بھرے ہُوئے ناکام لیڈر کی طرح انگریزی ہی میں اس کو تُرکی بہ تُرکی جواب دیا، لیکن غصّے کی زیادتی اور انگریزی کی کمی کی وجہ سے عمر کی گھگھی بندھ گئی اور چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ "مور اور" کے انداز میں ہم سب کو گندی گالیاں دینے لگا اور رومال سے اپنا تمتمایا ہُوا چہرہ صاف کرنے لگا۔

مفتی نے اس ناخوشگوار حادثے کے درمیان بڑی محبت بھری آواز میں اعظمی سے پُوچھا :

"اچھا پھر کیا ہُوا ؟"

"پھر کیا ہُوا کیا ؟" اعظمی نے تعجب سے پُوچھا تو مفتی نے کہا :

"یار اس صُغریٰ کا۔"

ہم سب زور سے ہنسنے لگے، تو لیڈر نے ایک زوردار ہُبجھ ماری اور ہم سب سے چھ سات قدم آگے چلنے لگا۔

"اس کا کیا ہونا تھا مفتی جی!" اعظمی نے کہا۔ "وہ چلی گئی۔ رفحان آئل کا ڈبہ لینے گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔"

"اُسی کے ساتھ!" عمّاد نے پُوچھا۔ "نیلی پتلون اور پیلی جرسی والے کے ساتھ!"

"اب مَیں کیا عرض کر سکتا ہُوں۔" اعظمی نے کہا۔

"عرض کرو صیب! کیوں نہیں کرو۔" کہستانی نے کہا۔ "اُسی کے ساتھ گئی ہوگی وہ حرامزادی۔"

"تُو ہماری باتیں سمجھتا ہے۔" عمّاد نے چیخ کر پُوچھا۔ اور ہم سب رُک گئے۔

"سمجھتا ہے صیب! سمجھتا کیوں نہیں۔ یہ کون سی مشکل بات ہے سمجھنے کے لیے۔ عورت کی بات ہر کوئی سمجھتا ہے، لیکن ہم ڈبّے کی بات نہیں سمجھتا۔"

ہم سب حیرانی سے اس کا مُنہ تکنے لگے، تو مفتی نے کہا :

"یہ رفحان آئل کے ڈبّے کو پُوچھ رہا ہے گدھو! مُنہ اُٹھا کر کیا کھڑے ہو گئے ہو۔ چلو! آگے چلو۔"

ہم سب چلنے لگے تو مفتی جی نے کہا :

"اس دُنیا میں جہاں کہیں کوئی قتل ہوتا ہے تو اس کا ایک سُراغ ایک کلُو ایک اشارہ ضرور ہوتا ہے اور جب کبھی کوئی عورت بھاگتی ہے تو اس کے ساتھ ایک رمز ضرور ہوتی ہے جو اس کے اُدہالے کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔"

اعظمی کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔ صغریٰ کے بھاگنے میں اعظمی کے رفحان کا ڈبہ بھی کھڑکھڑاتا ہوا ساتھ جا رہا تھا۔

اس وقت جہاں ہم چل رہے تھے پہاڑ کی اونچائی زیادہ نہیں رہی تھی۔ ارد گرد کے سلسلہ ہائے کوہ البتہ بلند ہوگئے تھے اور ان پر سفید برف جمنے لگی تھی۔ پہاڑ دُور تھے، مگر ان کی برف نزدیک دکھائی دیتی تھی۔ برف نزدیک تھی مگر اس کی ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ چمک دُور تھی، مگر اس کی چلکور آنکھوں کے قریب پہنچ کر پریشان کر رہی تھی۔ لیڈر نے پتلون کی جیب سے سیاہ چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگا لیا اور پیچھے مُڑ کر ہم سب کو تفریحی بھرے انداز میں دیکھا، کیونکہ ہمارے پاس سیاہ چشمے نہیں تھے۔ ہم اپنے اُونچی جاتی کے برہمن لیڈر کے پیچھے پیچھے آدمی باسیوں کی طرح چل رہے تھے اور ہم کو تھوڑی تھوڑی سردی لگنے لگی تھی۔

مفتی نے بڑے دُکھ بھرے انداز میں عماد سے کہا:

"ذرا ہمارے لیڈر کو دیکھو، ساتھ چلنے کو بھی تیار نہیں۔"

"بس ایسے ہی ہوتا ہے مُفتی!" مسعود نے سر جھکا کر کہا: "اس پر زیادہ غصہ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ زیادہ غصہ کرو گے تو خود ہی ٹوٹنے لگو گے۔"

"وہ بھی ٹوٹ سکتا ہے، شالا لیڈر!" اعظمی بولا۔

"ٹوٹ تو سکتا ہے اور ٹوٹ بھی جاتا ہے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔" مسعود نے کہا۔ "میرا مطلب ہے آج تک ٹوٹ پھوٹ سے کسی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔"

"یہ سالا ملامتی ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "اس کی کوئی بات نہ سنو، ورنہ یہ ہم کو بھی اپنے جیسا بنا لے گا۔"

"ملامتی اس جیسے نہیں ہوتے۔" عماد نے کہا۔ "ان کی کریں سیدھی اور گفتگو صاف ہوتی ہے۔ یہ تو کُبڑا بھی ہے اور ہکلاتا بھی ہے۔ یہ کیسے ملامتی بن سکتا ہے۔"

مفتی نے بے اولاد بوڑھی اونٹنی کی طرح عماد کی طرف دیکھا اور اپنا دکھ اندر ہی پی گیا۔ وہ سائنس کے خلاف ہونے کی وجہ سے عماد سے اتنی محبت نہیں کر سکتا تھا جتنی وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی ہر بات کی کُھل کر داد بھی نہیں دیا کرتا تھا، کیونکہ عماد کی ہر بات کی بُنیاد سائنس

اور منطق پر ہوتی تھی اور مفتی کو سائنس اور منطق سے خُدا واسطے کا بیر تھا۔ مفتی اپنی شفقت کے اس حصّے کا اظہار بھی نہیں کر پاتا تھا جو خُدا نے اُسے صرف عمّاد کے لیے دیا تھا۔ نہ اس پیار کی جھلک دکھا سکتا تھا جو ازلی حکم کے تحت خاص عمّاد کے لیے الاٹ ہُوا تھا۔ مفتی کی حالت اس باپ جیسی تھی جو اپنے آسُودہ حال، تابع فرمان، نیک نام اور باادب بیٹے کے مقابلے میں بدلحاظ، بے روزگار اور بے ادب بیٹے سے زیادہ محبت کرتا ہو اور ہر وقت اسی کے غم میں گھُلتا رہتا ہو۔ اسی کی فکر میں رہتا ہو اور اسی کے لیے کوشش کیا کرتا ہو اور ایسے ہی کبھی کبھی اُسے اپنے تابع فرمان اور نیک نام بیٹے کا خیال بھی آجاتا ہو کہ محبت کے معاملے میں اس سے زیادتی ہو رہی ہے اور اُسے اُس کا حصّہ نہیں مل رہا۔ اپنی بے انصافی پر اور سعادت مند بیٹے کی حق تلفی پر ایسے باپ کو دُکھ ضرور ہوتا ہے، لیکن اس دُکھ کی معیاد لمبی نہیں ہوتی اور اس دُکھ سے عمل کی صُورت پیدا نہیں ہوتی۔

عمّاد نے کہا:

"مفتی جی! ملامتی فرقے کے لوگوں کا ایمان ہے کہ نفس ہمیشہ دھوکا دہی کی طرف مائل رہتا ہے۔ نفس چاہے آگے آگے چل کر رہبری کر رہا ہو چاہے پیچھے چل کر پیروی کر رہا ہو۔ چاہے باادب، تابع اور فرماں بردار بن جائے، چاہے باغی اور سرکش ہو جائے اس کا کوئی اعتبار نہیں... کبھی بھی اعتبار نہیں... ہرگز اعتبار نہیں۔"

مفتی نے چڑ کر کہا:

"اوئے جا! آیا بڑا صُوفیوں کا دل ٹٹولنے والا۔ تُو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کام۔ رہنا مشینوں میں، سونا ٹیکنالوجی میں، سوچنا فزکس میں اور بات کرنی ملامتیوں کی!"

عمّاد نے ہنس کر کہا:

"یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں بادشاہو! فزکس اور فقیری جب اپنے اپنے معراج کو پہنچتی ہیں، تو ایک ہی شے بن جاتی ہیں۔ دونوں جب تحیّر میں ڈُوبتے ہیں، تو ان کی ہیئت کذائی ایک سی ہو جاتی ہے۔"

"اب یہ محض علمی بکواس کے زور پر مفتی کا دل جیت رہا ہے۔" اعظمی چیخ کر بولا۔ "جیتنے

نہ دینا مفتی! ہرگز نہیں جتنے دینا اپنے دل کو۔"

"تمہیں یاد ہے مسعود!" عماد نے لاتعلقی سے کہا۔ "سن چھیاسٹھ میں ہمارے پاس ایک دُبلا پتلا، بڑی عمر کا الیکٹرونک انجینئر آیا تھا۔"

"موسیو دیمانش — سنہری عینک والا۔" مسعود نے یاد کیے بغیر کہا۔ "نیولا سا — دھیمی آواز والا۔"

"وہ بہت بڑا آدمی تھا۔ دنیائے سائنس کا مانا ہوا نام۔" عماد نے کہا۔ "اس نے نیلز بوہر کے ساتھ کام کیا تھا پورے تین سال۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ پاکستان آیا اور پورے چھ مہینے تک ہمارے ساتھ رہا۔"

"اپنے ساتھ کو ہمارے ساتھ کیوں کر رہا ہے بے!" اعظمی نے شرارت سے کہا تو عمّاد نے اس کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے سانس روک لی اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ بولا:

"وہ ملامتیہ فرقے سے تعلّق رکھتا تھا۔ موسیو دیمانش!"

مفتی ایک دم رُک گیا اور اس کے ساتھ ہم بھی ٹھہر گئے۔ عمّاد کے چہرے پر پسینہ سا آ گیا، جیسے کسی ناخوشگوار یاد پر چہرہ ہلکا سا نمناک ہو جایا کرتا ہے۔ عمّاد کی آنکھیں پہلے سے بھی خوبصورت ہو گئیں اور اس نے بتایا کہ موسیو دیمانش کے پاس ایک پرانا فرانسیسی مخطوطہ تھا جس پر فرقۂ ملامتیہ کے سینتالیس خصائص درج تھے اور جسے ایک ایک کر کے اس نے عمّاد کے لیے انگریزی میں منتقل کیا تھا اور اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ یہ قاعدہ کسی اور کو ہرگز نہیں دکھائے گا۔

"سوائے ہمارے!" اعظمی نے بلند آواز میں کہا۔

"نہیں تمہیں بھی نہیں۔ آئی ایم سوری . . . یہ ایک عہد ہے۔" عمّاد نے کہا۔

"لیکن یار سائنس دان!" اب مفتی کے تیور ڈھیلے پڑ رہے تھے اور وہ ہارے ہوئے انسان کی طرح گھر واپس جا رہا تھا۔ اس نے عمّاد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت بھرے انداز سے پوچھا:

"اس کو کیا ہو گیا تھا۔ اس فرانسیسی کو۔ جس کا نام تم لوگ لے رہے ہو!"

عمّاد نے کہا :

"مفتی جی، وہ عجیب آدمی تھا۔ فرسٹ تھا۔ ساتھ ہی سارتر کا ہم خیال تھا۔ الجزائر میں اپنے ہم وطن فرانسیسیوں کے خلاف لڑتا رہا تھا ــ وہاں ایک شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر سات سال کسی زاویے میں بھی رہا تھا۔ چاک پر مٹی کے برتن بنالیتا تھا۔ گھنگی جیسی آواز میں ورد کرتا تھا اور سب سے اونچے ٹرانسمیٹر لول پر بلا خوف و خطر چڑھ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سائنس کے باریک مسائل کو مکالمے اور مباحثے کی بُنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ نہ ہی ایسے مناظروں پر فخر کرنا چاہیے۔ اور نہ ہی کسی بے حقیقتے اور بے ہدایتے کے سامنے خُدا کے بھیدوں کا اظہار کرنا چاہیے۔ ڈیمانش کہتا تھا کہ غلامی اور تابعداری کی رُوح صرف دو سہاروں کی بنیاد پر قائم ہے : خُدا کی ضرورت کو بالحق ماننا اور اُس کے نبی صلے اللہ علیہ وسلّم کے نقوشِ قدم کے قریب تر رہنا۔"

ہم سب اپنی اپنی جگہ دم بخود کھڑے تھے اور لیڈر اپنے سیاہ چشمے سمیت دُور ایک پتھر پر بیٹھا ہُوا تھا۔

عمّاد نے کہا۔ ڈیمانش کے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ حُسن ایک خُوبی ہے اور عشق ایک جوہر، بشرطیکہ دونوں راز ہو کر رہیں اور سوائے خُدا کے اور کسی کو ان کا علم نہ ہو۔ اپنے عشق کا اظہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بھک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بھک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں۔ اِن کے درمیان فقیروں کا کیا کام!

اگر آپ کبھی لاہور آئیں اور یہاں کی مال روڈ سے گزریں اور جس سواری میں آپ سفر کر رہے ہوں وہ وائی ایم سی اے والے چوراہے کی سُرخ بتّی پر رُک جائے، تو ایک منٹ کے لیے ضرور سوچیں کہ ارد گرد بہت سے بنکوں کے درمیان ایک بنک ہے جس میں ایک صاحب دل مینجر کام کر رہا ہے جو اَب ریٹائرمنٹ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ میں اس کو اکتوبر سن باون سے جانتا ہُوں جب میں نے دیال سنگھ کالج کی نوکری کے دوران اس کے پاس اپنا اکاؤنٹ کھولا تھا۔ اس وقت وہ اکاؤنٹس کلرک تھا اور سیلر بیچلر کے سگریٹ پیا کرتا تھا۔ بنک کے سب ملازم اور افسر اس کو بابو سراج کہتے تھے کہ وہ ہر وقت تھری پیس سوٹ میں ملبوس رہتا اور کوٹی سینٹ اور کوٹی ہیئر آئل استعمال کیا کرتا۔ اس کو شدھ راگ، خوشبودار چائے اور قیمتی

فاؤنٹین پن سے عشق تھا۔ اُردو افسانے کا مارا ہُوا اور نیو تھیٹرز کی فلموں کا ڈسا ہُوا۔ بابُو سراج خود تو سارا دن اکاؤنٹس رجسٹروں پر کھڑا رہتا، لیکن اس کی رُوح محبّت کے چرنوں میں بیٹھی المحوں کی آرتی اُتارتی رہتی۔ بابُو سراج اندر سے خوبصورت اور باہر سے بڑا شکیل انسان تھا۔

مَیں کالج سے لَوٹتے وقت تقریباً ہر روز بابو سراج سے ملتا اور مجھے اس سے مل کر ویسی خوشی ہوتی جیسے ہنچ بیک کو اپنی محبُوبہ سے مل کر ہُوا کرتی ہوگی۔ خفت، ندامت، احساسِ کمتری اور اس کے ساتھ بے پناہ خوشی! وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر بنک کے سٹاف رُوم میں اپنے ہاتھ سے چائے بناتا۔ قرینے سے برتن لگاتا اور پھر بڑی محبت سے پرچ اور پیالی کو ٹشو پیپر سے سکھا کر چائے کی پیالی پیش کرتا۔ مجھ کو اس ذہین، خوبصورت، پڑھے لکھے اور سادھارن نوجوان کے ساتھ بابو کا لفظ بہت ہی بُرا لگتا تھا، لیکن اس کو پسند تھا کہ یہ نام اُسے بنک کے ہیڈ چپراسی نے دیا تھا جو اس کے محلّے میں رہتا تھا اور اس کے والد کا دوست تھا۔

ہم دونوں کے درمیان ایک مشترکہ دوست بھی پیدا ہو گیا تھا۔ رضی بی۔اے۔ اس کے پاس نورٹن موٹر سائیکل تھی اور وہ چھوٹی بحر کی غزلیں لکھا کرتا تھا۔ رات کے وقت رضی کا ڈیرا اکثر کامران کی بارہ دری میں لگتا اور وہ راوی کے بہتے ہُوئے پانیوں کو دیکھ دیکھ کر صبح کر دیتا تھا۔ اس قدر رُومانوی طبیعت رکھنے کے باوصف رضی کی غزلیں بابُو سراج کو پسند نہ تھیں کہ ان میں دُکھ کے بجائے شکوے کا عنصر زیادہ تھا اور وہ حالاتِ زمانہ سے اور عمومی واقعات سے جنگ کرتا رہتا تھا۔ مجھے اس کی شاعری بہت پسند تھی، کیونکہ اس کے ہر شعر میں کسی نہ کسی پر ایک آدھ چوٹ ضرور ہوتی تھی۔ کسی کسی شعر میں تو وہ دو دو تین تین چوٹیں بھی کر جاتا تھا اور ان مرکب چوٹوں میں بڑا ہی لُطف آتا تھا۔ رضی آسودہ حال رُومانوی نوجوان تھا اور زمانے کا شاکی تھا۔ بابو سراج اکاؤنٹس کا اونگر زکا آدمی تھا اور ہر وقت بیمار رہتا تھا۔ حزنوں، تفریقوں سے لڑ لڑ کر اس کے اندر بڑی عاجزی اور ملائمت پیدا ہو گئی تھی۔ ہم اس کی غیر موجودگی میں اس کو حلوائے بیخاب کہا کرتے تھے اور اس کے بارے میں متفکر رہتے تھے کہ اس کا کیا بنے گا۔

گرمیوں کے موسم میں پُورے دو ہفتے کی رُخصت لے کر بابو سراج کوہ مری ضرور جاتا۔ اپنے پسندیدہ افسانوں کے مجموعے، چائے کا سامان، فلیٹ بُوٹ، چیری کی چھڑی اور تہہ ہونے والی

چھتری اس کے مخصوص شریکِ سفر تھے۔ اس کی دو بہت ہی پیاری اور مُنّی سی بلبلیں بھی تھیں۔ ایک تین سال کی اور دوسری پانچ سال کی۔ دونوں اپنے ابّو کے انتظار میں دہلیز پر بیٹھی رہتیں اور جب بابو سراج بنک سے واپسی پر گلی میں داخل ہوتا، تو دونوں ایک ساتھ بازو پھیلا کر اس کی طرف بھاگتیں اور اسے دونوں کو ایک ساتھ سنبھالنا مشکل ہو جاتا ــــ مری سے واپسی پر بابو سراج ان کے لیے گرم ٹوپیاں، گرم دستانے، میٹھی گولیاں اور ایک ایک گڑیا ضرور لاتا۔ ان کی ماں کے لیے ایک شال اور اپنی والدہ کے لیے کبھی نمدہ، کبھی دُھسّا اور کبھی جانماز ــــ لیکن ایک مرتبہ جو وہ مری گیا، تو کسی کے لیے کچھ بھی نہ لا سکا اور سب کے چہرے اُداسی کی دُھول سے اٹ گئے جیسے قبر کے اندر پہلی رات کے بعد مُردے کا چہرہ ہو جاتا ہے۔

تیرہ تاریخ کو ہم سب سے مل کر وہ مری کے لیے روانہ ہُوا اور پندرہ تاریخ کو جب میں ایک چیک کیش کرانے بنک گیا تو وہ کاؤنٹر پر کھڑا رجسٹر میں ڈیبٹ کریڈٹ اندراج کر رہا تھا۔ اس کو یُوں کھڑے دیکھ کر میرے مُنہ سے ایک چیخ نکل گئی اور میرا یقین متزلزل ہو گیا۔ وہ دس منٹ کے لیے اپنے ساتھی کو چارج دے کر پین بند کرتا ہُوا میرے ساتھ بنک سے باہر آ گیا۔ ہم دونوں بنک کے سامنے مال روڈ کے ایک تناور درخت کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں کھڑے ہو گئے۔

اُس نے کہا: "اشفاق جی! مَیں کیا بتاؤں کہ مجھ پر کیا حادثہ گزرا اور مجھے کس لیے اتنی جلدی لاہور واپس آنا پڑا۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا، کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا۔ میری ساری چھٹیاں برباد ہو گئیں۔ سارا پروگرام تباہ ہو گیا، لیکن مَیں اس کے سوا اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مجبور تھا۔"

کہنے لگا: "مَیں تیرہ تاریخ کو بعد دوپہر مری پہنچ گیا۔ سامان مَیں نے ایجنسی پر رکھا اور ذرا نظارہ لینے کے لیے نچلی سڑک پر چلتا ہُوا پنڈی پوائنٹ پہنچ گیا۔ اس دن بڑی مزیدار دُھوپ تھی، لیکن اس میں اتنی تلخی نہیں تھی جتنی پہاڑوں کی دھوپ میں ہُوا کرتی ہے۔ کچھ دیر میں پنڈی کی طرف مُنہ کر کے بنچ پر بیٹھا رہا، پھر اُٹھا۔ سویٹر کو کمر پر ڈالا۔ اس کی لمبی آستینوں کو گردن کے گرد موٹی سی گرہ دی اور اپنی چھڑی ٹکٹکاتا ہُوا ڈاکخانے کی طرف چل دیا۔ اس مرتبہ بے شمار لوگ آئے تھے اور سیزن بہت بھرکے لگا تھا، لیکن اتنے سارے لمبے راستے پر مجھے کوئی بھی واقف صُورت

نظر نہ آئی اور مَیں اپنے اکیلے پن کی خوشی میں لٹکتا مٹکتا مال روڈ پر خراماں خراماں چلتا رہا۔ ابھی مجھے کسی ہوٹل میں بھی اپنا بندوبست کرنا تھا اور شام کے وقت لمبی سیر کے لیے پھر نکلنا تھا، لیکن اس بات کا میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں تھا اور مَیں خراماں خراماں چل رہا تھا۔ پھر مَیں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک کپ گرم گرم خوشبودار خاکستر رنگت چائے کا پیا جائے۔

مَیں لن ٹاٹس میں بید کی کُرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور اپنی چھڑی کا سر گود میں رکھ لیا۔ بیرے نے ایک جھمجماتا ہُوا پیسٹری سٹینڈ میرے سامنے لا کر رکھ دیا اور خود چائے لینے چلا گیا۔ مَیں نے پیسٹری میں سے وہی میٹھی روٹی پان کا پتہ اُٹھا لیا جو مَیں شوق سے کھایا کرتا تھا۔ ابھی مَیں نے اس میٹھے پتّے کے دو ہی دانت کاٹے تھے کہ بیرا چائے لے کر آ گیا۔ مَیں نے جلدی سے چائے سُڑکی۔ گیلی پیالی کو جھڑکا۔ جیب سے ٹشو نکال کر پرچ اور پیالی دونوں کو سکھایا اور آدھی چمچی چینی کی ڈال کر چائے پوری کی۔ بڑا فسٹ کلاس گرم گرم دُودھ تھا اور بہت ہی اچھی چائے تھی۔ دونوں ایک سی حرارت کی وجہ سے فوراً گھل مل گئے اور مجھے چمچ تک ہلانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

میرے دائیں ہاتھ میں میٹھا ٹکڑا تھا اور بائیں ہاتھ میں چائے کی پیالی۔ ابھی مَیں نے پہلا ہی گھونٹ بھرا تھا اشفاق صاحب اور پیالی میرے ہاتھ ہی میں تھی کہ لن ٹاٹس کی سیڑھیوں پر ایک ماں بیٹی نمودار ہُوئیں اور میری قریبی ٹیبل کی طرف آ کر بیٹھنے کی تیاری کرنے لگیں۔ وہ لڑکی اشفاق جی، اتنی خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے دیکھ کر میرا رونا نکل گیا۔ مَیں نے پیالی پرچ میں رکھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ادھ کھایا میٹھا ٹکڑا چھوڑا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر کاؤنٹر کی طرف جاتے ہُوئے مَیں نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بیرے کو وہیں بُلا کر پے منٹ کر دی۔ ریستوران سے باہر نکلتے ہُوئے مَیں نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ بڑی بے عزّتی کی بات تھی اشفاق جی! دو بچّوں کا باپ، بنک ملازم، تعلیم یافتہ، مرد ذات، اس طرح سے پھُسپھُساتا ہُوا اچھا لگتا۔ مَیں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا، لیکن میرے دل میں ایک بہت بڑی کُنڈی پھنس گئی تھی۔ تین نوکوں والی جیسے لنگر نہیں ہوتا پانی میں پھینکنے والا، ویسی! اور وہ لڑکی بھی اتنی خوبصورت تھی اشفاق جی کہ بندے کا رونا نکل جائے اس کو دیکھ کر۔ اس کی آمد پر سب لوگ، چائے پینے والے، سارے مرد عورتیں دم سادھ کر خاموش ہو گئے تھے اور کوئی اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔

اس لڑکی نے اپنے سر پر سُرمئی مخملی کے چانے انگی فرکی ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور وہ ٹوپی کافی ٹیڑھی تھی۔ اس کا ناک نقشہ تو مجھے یاد نہیں، لیکن اس کا چہرہ اب بھی نظروں کے سامنے گھوم رہا ہے۔

میں جلدی جلدی لمبے لمبے قدم اٹھاتا واپس ایجنسی پر پہنچ گیا۔ وہاں سے اپنا سامان اٹھایا اور سامنے کھڑی ہوئی لاری میں سوار ہو کر پنڈی پہنچ گیا۔ ایک رات پنڈی ہوٹل میں بسر کی اگلے دن لاہور آگیا اور یہاں آکر اپنی چھٹی کینسل کروادی۔ اس عمر میں کون روز روز روتا پھرے اور لوگوں کے سامنے ذلیل ہوتا رہے۔ دیکھو ناں جی! پندرہ دن تک تو اس نے نظر آتے ہی رہنا تھا بار بار۔ ایک ہی تو سڑک ہے ساری مری میں۔ تو میں نے کہا بھاگو بھائی۔ تو جی بھاگ آیا۔۔۔ دیکھو ناں! اشفاق جی! اپنی دل بیتی کا اظہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بھک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بھک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں!"

اب جھیل نزدیک آرہی تھی اور ہم لوگوں کو احساس ہونے لگا تھا کہ اس وقت ہم منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں۔ مسعود، عمّاد کا بازو پکڑے اُس کے ساتھ ساتھ سر دُھنتا جا رہا تھا کہ "واہ! اپنے عشق کا اظہار کرنا گویا ایمان والوں کا ساتھ چھوڑ کر بھک منگوں کے ساتھ ملنا ہے اور بھک منگے تو لاکھوں ہزاروں قدم قدم پر بازو پھیلائے نظر آتے ہیں۔۔۔ ان کے درمیان فقیروں کا کیا کام!" اور جب وہ "ان کے درمیان فقیروں کا کیا کام!" کہتا تو لفظِ فقیر پر ایسے لوچ کھاتا جیسے پُرانے زمانے کی لمبی گُت والی لڑکی پینگ میں اپنی رانوں کی طاقت سے ہلارا بھر رہی ہو، فقیروں کا کیا کام! فقیروں کا کیا کام!! ہیں مفتی! فقیروں کا کیا کام... جس نے ظاہر ہی کر دیا وہ فقیر کہاں رہا۔ کیوں اعظمی! وہ آدمی تو تنکے سے بھی ہولا ہو گیا منصور نے اظہار کر کے ہی تو مار کھائی۔ سُولی پر چڑھ گیا۔ یار کا بھید کھول دیا۔ اور بھید کھولنے کی یہی سزا ہے۔ کیوں عمّاد! ہے کہ نہیں سزا؟ بولو یارو!

عمّاد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا... کہ جب لوگ درخت سے آنے والی اِنِّی اَنَا اللّٰہ کی صدا کو جائز قرار دیتے ہیں، تو منصور حلاج کے مُنہ سے نکل جانے والے "اَنَا الْحَق" پر گرفت کیوں کرتے ہیں۔ لیکن جو منصور کو ملحد ساحر اور زندیق کہتے ہیں وہ بھی ٹھیک ہیں اور جو اس کو عالمِ ربانی سمجھتے ہیں وہ بھی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

جس روز منصور حلاج کو پھانسی دی جانی تھی، اُس روز صبح سے ہی لوگ مقتل کی طرف روانہ

ہونے لگے تھے اور دوپہر تک سارا بغداد اُمڈ کر مقتل گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ سہ پہر کے قریب بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنا کر منصور کو مقتل کی طرف لے جایا گیا۔ راستے میں لوگ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور اَللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ کے نعرے لگا رہے تھے اور ملزم پر پتھر، ڈھیلے، کنکریاں مار رہے تھے منصور کے دونوں طرف دو سپاہی اس کی زنجیروں کو اپنی کلائیوں کے گرد لپیٹے چل رہے تھے اور تیسرے سپاہی نے اس کے بالوں کو پیچھے سے اپنے چُنگل میں جکڑ کر اس کا مُنہ آسمان کی طرف اُٹھایا ہُوا تھا۔ راستے میں ٹھاٹھیں مارتے ہُوئے انسانی سمندر کی وجہ سے ملزم اور اُس کے نگران بڑی آہستگی سے چل رہے تھے اور اُن کو رُک رُک کر آگے سے راستہ صاف کرانا پڑتا تھا۔

کہتے ہیں کہ جس روز حسین منصور حلاج کو قید میں ڈالا گیا، اُس روز لوگوں نے دیکھا کہ رات کے وقت منصور وہاں موجود نہیں تھے۔ دُوسری شب نہ منصور موجود تھے نہ بندی خانہ اور تیسری شب میں بڑے آرام کے ساتھ بیڑیاں پہنے ہُوئے اپنی کوٹھڑی میں موجود تھے۔ جب لوگوں نے وجہ پُوچھی، تو فرمایا کہ پہلی شب تو میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر تھا اور دُوسری شب حضورؐ خود یہاں تشریف فرما تھے۔ لوگوں نے پُوچھا پھر آج یہ واقعہ کیوں نہیں گزرا۔ فرمانے لگے، اب مجھے شریعت کے تحفظ کے لیے واپس بھیج دیا گیا ہے کہ میں قرار واقعی سزا پاؤں اور شریعت میں کوئی رخنہ پیدا نہ ہو۔

قید خانے میں آپ کے علاوہ تین سو اور قیدی بھی موجود تھے۔ منصور نے کہا: "کیا چاہتے ہو کہ تم کو اس جیل سے رہا کر دُوں اور تمہارے مقدر میں آزادی لکھ دُوں" تو قیدیوں میں سے چند ایک نے ایک ساتھ آواز لگا کر کہا: "ہم بدنصیبوں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی" آپ نے ایک اشارہ کیا تو سب قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کر گر گئیں، پھر اشارہ کیا تو تمام قفل ٹوٹ گئے۔ پھر آپ نے قیدیوں سے فرمایا: "جاؤ ہم نے تمہیں رہا کیا" اور جب قیدیوں نے آپ سے التجا کی کہ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں، تو اُنہوں نے مسکرا کر فرمایا: "میرے اور میرے آقا کے درمیان ایک راز وابستہ ہے جو سُولی پر چڑھے بغیر حل نہیں ہو سکتا۔ گو میں اپنے آقا کا قیدی ہُوں، لیکن شریعت کی پاسداری بھی نہایت ضروری ہے اور میں شریعت پر کسی قسم کی آنچ آتے نہیں دیکھ سکتا، اس لیے مجبور ہُوں۔ ہمارے آقا کا ہم پر عتاب نازل ہے اس لیے میں ٹھہر گیا۔"

جس وقت منصور حلاج اور اس کے نگرانوں کا طائفہ سُولی سے تھوڑی دُور رہ گیا تو شمال کی جانب سے گہری سُرخ آندھی اُٹھی اور اُس نے بغداد کے آسمان پر منجمد ہو کر اپنی نگاہیں نیچے خلقت پر مرکوز کر دیں۔ اب تیسرے سپاہی نے ان کے بالوں سے اپنا ہاتھ نکال لیا تھا اور ان کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ منصور اپنی گردن گھما کر اس جمِ غفیر کو دیکھنے لگے اور ہر سمت نگاہیں پھیر کر حَق حَق حَق، اَنَا الحَق کہنے لگے۔

ایک شخص نے آگے بڑھ کر پوچھا: "منصور! عشق کسے کہتے ہیں؟"

منصور نے ہنس کر کہا: "آج کل اور پرسوں میں تجھے معلوم ہو جائے گا۔"

جب سُولی کا چبوترہ قریب آگیا، تو آپ کے خادم نے روتے ہوئے وصیت کے متعلق عرض کیا، تو فرمایا: اپنے نفس کو تمام علائق دُنیا سے خالی کر لے، ورنہ یہ نفس تم کو ایسی چیزوں میں پھانس دے گا جو تیرے بس کی نہ ہوں گی۔

جب آپ کے صاحب زادے نے آگے بڑھ کر وصیت کی درخواست کی، تو فرمایا: "ساری دُنیا نیک چلن اور اعمالِ صالحہ کی کوشش کرتی ہے، لیکن تجھے علمِ حقیقت حاصل کرنا چاہیے، کیونکہ علمِ حقیقی کا ایک نکتہ بھی تمام اعمالِ صالحہ پر بھاری ہوتا ہے۔"

اس کے بعد آپ شاداں اور فرحاں گنگناتے اور لکھتے ہوئے سُولی کی طرف بڑھے، تو قریب کھڑے لوگوں نے پوچھا: "اس قدر مسرور کیوں ہو؟"

کہنے لگے: "اس سے زیادہ مسرت کا وقت اور کون ہو سکتا ہے جب میں اپنی منزل پر پہنچ رہا ہوں اور محبوب کے سامنے جا رہا ہوں۔"

سُولی کے چبوترے کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے آپ نے ذرا جھک کر اپنی عبا کے کنارے سے سیڑھیوں پر جھاڑو دی، پھر چبوترے پر آئے اور آگے بڑھ کر اس چوکھٹے کو بوسہ دیا جس میں پھندا لٹک رہا تھا۔ لوگوں نے اونچی آواز میں پوچھا: "اپنے موافقوں اور مخالفوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

فرمایا: "میرے موافقوں کو کم از کم ایک اجر تو ضرور ہوگا کہ وہ مجھ سے حُسنِ ظن رکھتے تھے، لیکن میرے مخالفوں کو دو ثواب حاصل ہوں گے کہ وہ قوتِ توحید میں اور شریعت پاک میں سختی

سے خائف رہتے ہیں۔ اور اس شہر کے لوگو! کان کھول کر سن لو کہ شریعت میں اصل شے توحید ہے اور جو وحدانیت سے سرِ مُو انحراف کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس وقت حضرت شبلیؒ نے بڑی عاجزی سے پُوچھا: "تصوّف کس کو کہتے ہیں؟"

"فرمایا: "یہ جو تم دیکھ رہے ہو، یہ تصوّف کا ادنیٰ ترین درجہ ہے، کیونکہ اعلیٰ ترین درجے سے تو کوئی واقف ہی نہیں۔ ہماری تو یہاں تک پہنچ کر رُوح فنا ہو جاتی ہے۔" پھر فرمایا: "خُدا کی یاد میں دنیا و آخرت کو فراموش کر دینے والا ہی واصل الی اللہ ہوتا ہے اور خُدا کے سوا ہر شے سے مُستغنی ہو کر عبادت کرنا فقر ہے اور صُوفی اپنی ذات میں اسی لیے واحد ہوتا ہے کہ نہ تو وہ کسی کو جانتا ہے اور نہ اس سے کوئی واقف ہوتا ہے۔"

پھر فرمایا: "حکمت ایک تیر ہے اور خُدا تعالیٰ تیر انداز ہے اور مخلوق اس کا نشانہ ہے۔"

جب لوگوں نے پُوچھا کہ "سب سے بڑا اخلاق کیا ہے؟"

تو آپ نے فرمایا: "سب سے بڑا اخلاق جفائے مخلوق پہ صبر کرنا اور اللہ کو پہچاننا ہے۔ جس طرح بادشاہ ہر لمحہ ہوسِ ملک گیری میں مُبتلا رہتے ہیں، اسی طرح ہر لمحہ ہم مصائب کے طالب رہتے ہیں۔"

پھر زمین کی طرف نظریں جھکا کر کہنے لگے: "ذاتِ خداوندی جس پر منکشف ہونا چاہتی ہے، تو ادنیٰ سی شے سے لے کر اس پر منکشف ہو جاتی ہے، ورنہ اعمالِ صالحہ کو بھی قبول نہیں کرتی۔ البتہ ایک بات ضرور ہے کہ جب تک صبر نہ کیا جائے عنایت حاصل نہیں ہوتی اور صبر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اُسے سُولی پر چڑھا دیا جائے تب بھی اُس کے مُنہ سے اف تک نہ نکلے۔"

اس کے بعد جلّاد کے کہنے پر لوگوں نے آپ کو سنگسار کرنا شروع کر دیا جس کو آپ نہایت خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ جب جلّاد کے اشارے پر لوگ سنگباری سے رُکے اور اُس نے آگے بڑھ کر شمشیرِ آب دار سے ان کے دونوں ہاتھ کاٹے، تو خُون کا فوارہ اُبل پڑا۔ لوگوں نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ تو آپ نے نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھا کر سرگوشی میں شکریہ ادا کیا۔ پھر خون بہاتی کلائیوں کو چہرے پر پھیر کر نظریں اُونچی کیں اور کہا: "میری سُرخروئی اچھی طرح سے مشاہدہ کر لو، کیونکہ خُون جوانمردوں کا اُبٹن ہوتا ہے۔"